3. اس نظم کا زبان زد خاص و عام شعر کون سا ہے؟

26.6 نثار میں تری گلیوں کے ....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

Scanned by CamScanner

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ظلم ہے سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے ' نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں ' تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا ؟
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

26.6.1 نثار میں تری گلیوں کے.....کا تجزیہ

یہ نظم فیضؔ کے دوسرے شعری مجموعے ''دست صبا'' سے لی گئی ہے۔فیضؔ نے یہ نظم قید کے دوران لکھی۔نظم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر قید ہے اور اپنے وطن کی گلیوں کے تصور میں غرق ہے۔یہ نظم چار مصرعوں کے پانچ بند پر مشتمل ہے۔ہر بند کے بعد دو مصرعے ہیں۔پہلے بند میں شاعر اس ڈکٹیٹر شپ کے بارے میں اظہار کرتا ہے جہاں سخت پابندی ہے۔کسی کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔جہاں اختلافِ رائے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ہر نقل وحرکت پر پابندی ہے۔اپنے وطن میں آزادانہ گھومنے پھرنے کو بھی مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔اہلِ دل اور اہلِ نظر پر سخت پابندی ہے۔پتھر مقید ہیں اور کتے آزاد ہیں۔پتھر سے مراد وہ جو حق کی بات کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔دم ہلانے والے' بات بے بات غرانے والے آزاد ہیں۔ جو وطن کی بھلائی چاہتے ہیں ان پر ظلم کیا جارہا ہے۔اہل ہوس ہی مدعی بھی ہیں اور منصف بھی۔دعوی کرنے والے بھی اہل ہوس ہیں اور انصاف کرنے والے بھی وہی ہیں۔ایسے میں اپنی بات پہنچانا اور انصاف کی توقع رکھنا فضول ہے۔شاعر کہتا ہے کہ یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔فیضؔ کی نظم کا یہ بند ایسا ہے جہاں وطن کی محبت اور محبوب کا تصور ایک ہوجاتے ہیں۔شاعر چار دیواری میں قید ہے۔صرف زنداں میں ایک روزن ہے۔جب روشن داں اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اب رات ہوچکی ہے اور وطن کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی اور جب روزن سے آتی شعاعوں سے زنجیریں چمکنے لگتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صبح ہوچکی ہے۔اور وطن کے چہرے پر سحر نے اپنا نور بکھیر دیا ہوگا۔یہ وطن بھی ہوسکتا ہے اور محبوب بھی۔یہاں وطن اور محبوب کا تصور گھل مل جاتے ہیں۔شاعر شام وسحر اسی تصور میں گزار رہا ہے۔اسی تصور میں وہ در ودیوار کے سائے میں زندہ ہے۔اسی امید نے شاعر کو زندہ رکھا ہے۔اگلے بند میں شاعر کہتا ہے۔ظالم اور مظلوم کا یہ ٹکراؤ نیا نہیں ہے۔ظالم سے خلق ہی الجھتی ہے۔عوام ہی انقلاب کے نقیب ہوتے ہیں۔ صدیوں سے یہی ریت ہے۔صداقت اور حق کی بات کرنے والوں پر ظلم کی تاریخ بہت پرانی ہے۔انھیں مصلوب کردیا جاتا ہے۔ان کی راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔آگ میں پھول کھلانے کی تلمیح ابراہیمؑ سے وابستہ ہے۔ابراھیمؑ نے حق کے لیے آتش نمرود میں

Scanned by CamScanner

چھلانگ لگائی تھی اور آگ گلزار ہوگئی تھی۔ حق و باطل کی یہ کشمکش صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن شاعر کو یقین ہے کہ آخر میں جیت حق و صداقت کی ہوتی ہے۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اہل حق کا یہی اطمینان انھیں ہر ظلم برداشت کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں یہی بات انھیں حوصلہ عطا کرتی ہے اور وہ خدا سے گلہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فراق ہے۔ وطن سے جو دوری ہے قید کی جو زندگی ہے اس کی وجہ سے دل بُرا نہیں کرتے کیوں کہ کامیابی یقینی ہے

فیضؔ کو اپنی کامیابی پر کامل یقین ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ رات بھر کی جدائی ہے اس کے بعد صبح نو طلوع ہوگی۔ رات' ظلمت کا استعارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ظلم ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے یہ جو وطن سے جدائی ہے وہ عارضی ہے۔ آنے والے کل وہ وطن میں ہوں گے۔ یعنی پھر سے ان کی مصروفیات شروع ہو جائیں گی..... وہ جانتے ہیں کہ دشمن کا آج عروج ہے۔ لیکن یہ عروج ہمیشہ نہیں رہے گا۔ بس یہ چار دن کی جدائی ہے۔ اور خدائی بھی چار روزہ ہے۔ اس لیے وہ وطن سے عہدے وفا استوار رکھتے ہیں۔ اور ایک امید افزا صبح کے تصور میں دن رات گزارتے ہیں۔

فیضؔ کا ایقان صبح نو پر ہے۔ ایک انقلاب کی امید ہے۔ یہی امید انکی شاعری کو ایک نئی قوت بخشتی ہے اور یقین کو بلند سطح پر پہنچاتی ہے..... اس نظم میں بیانیہ اور علامتیں ساتھ ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ فیضؔ کی یہ نظم بیانیہ ہوتے ہوئے بھی راست اظہار کی حامل نہیں ہے۔ جسم چرانا' سنگ و خشت' سگ' اہل جنون' اہل ہوس' مدعی' منصف' آگ میں پھول' رقیب وغیرہ خوب صورت اشارہ بن گئے ہیں۔ وطن کی محبت اور تڑپ کا اندازہ اس نظم سے ہوتا ہے۔

فیضؔ کی شاعری میں گھن گرج اور نعرہ بازی نہیں ملتی۔ وہ ذہنی توازن نہیں کھوتے۔ قید و بند سے گھبراتے نہیں۔ انھیں اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ وہ قید میں ہیں اور اس طرح تحریکوں میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں لیکن یہ پختہ یقین بھی ہے کہ صورت حال بدلے گی اور ظلم کا دور ختم ہوگا۔ لہجے کا دھیما پن اور یقین کی پختگی ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ یہ نظم بھی اپنے عصر کی عکاسی کرتی ہے۔ ساتھ ہی فیضؔ کے جو دل میں گزرتی ہے وہ بھی رقم کرتے جاتے ہیں۔ فیضؔ کی آپ بیتی' جگ بیتی بن جاتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں درد کی ایک زیریں لہر بہتی ہے۔ اس نظم میں بھی اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر سلامت اللہ خاں لکھتے ہیں:

> ''فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال' ایسا درد و الم' ایسی غم انگیزی ہے جس میں ہارڈی یا فانی کی قنوطیت کی خنکی نہیں بلکہ جو حسین ہے' جو پر اسرار ہے۔ جو خواب آور ہے جو جمالیاتی لذت سے چور ہے۔ فیضؔ کی آنکھیں فکر مند بھی ہیں اور درد مند بھی..... لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کی آنکھیں منتظر بھی ہیں آنے والے محبوب کی..... کسی رنگین آنچل کی۔ گھنے درختوں پر تھکی ہوئی' سوئی ہوئی چاندنی کی۔ سرگوشیوں کی۔ ایک الجھے ہوئے موہوم سے درماں کی اور اس عہد نو کی جس پر انھیں یقین ہے۔''

(فیض احمد فیض۔ تنقیدی جائزہ ص 147)

فیضؔ کی اس نظم کے اشعار بھی زبان زد خاص و عام ہوئے۔ خاص طور پر یہ شعر:

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں' کس سے منصفی چاہیں

فیضؔ کی یہ نظم ان کی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

الف) وطن کی جدائی عارضی ہے آنے والا کل آزادی کی بشارت لائے گا۔

ب) وطن سے جدائی دائمی ہے اور قید خانہ ہی شاعر کا مقدر ہے۔

ج) شاعر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔

2. سنگ و خشت مقید ہیں اور ..... آزاد (سگ' چور' شجر)

Scanned by CamScanner